© rasailojaraid.com

تفردات رحمت اللہ طارق ؒ

حافظ فیض رسول
ریسرچ اسکالر شعبہ علوم اسلامیہ

ABSTRACT:

Islamic research,infact,is the modern equivalent to Ijtihad. It is not to discover in Islam something essentially new or that which was unknown to our forefathers. It is not to mould Islam to the vagaries of time and place or to caprice of human emotions and passions. Ijtihad is simply an effort to extend the basic and inherent values of Islam to meet new situations and to solve new problems, in order to keep society under the moral as well as legal authorities of Shariah.The reinterpretation of Islam to the modern times is not merely a theoretical issue. It is a biological necessity for the existence of Muslims as such.

The purpose of this article is to highlight the unique research work of Allama Rahmatullah Tariq (1929-2003) and to explore exclusively his reinterpretations of core Quranic verses regarding dogmas, beliefs, worship and legal injunctions.

This review article deals with his unique and wonderful ideas which gives us a new horizon in understanding the core issues and concepts of Islam. Allama Rahmatullah was a

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

learned scholar and an intellectual person and very articulate in his ideas. He has penned down voluminously on the Quran i.e., Tafsir Mansukh al Quran, Tafsir Burhan al Quran and Tafsir Mizan al Quran etc. In his writing he has dealt with many misconceptions and doubts which have arisen even in the matters of beliefs and worship. There are many problems which are agitating the minds of modern Muslims intellectual . These problems are inviting our urgent attention and deep thinking. They cannot be solved without intensive research and independent thinking. In this scenario Allama Rahmatullah has done a marvellous job. Sometimes he deviated from traditional ideas but it must be admitted that an establish society seldom allows deviation from tradition. Yet a total conformity to the past would mean the death-knell of creative effort.

In this article we have analysed Allama's such ideas from his original writings.

فکر انسانی ارتقاء پذیر ہے اور ہر مرحلے پر نئی آب وتاب اور نئے رنگ وروپ کے ساتھ نمودار ہوتی رہے گی۔ قرآن پاک کے بارے میں بار بار اس حقیقت کبریٰ کا اظہار کیا گیا ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا جائے گا اس کے حقائق منکشف اور صداقتیں عیاں ہوتی چلی جائیں گی یعنی فکر انسانی ارتقاء کے جن مراحل سے گزرے گی اس پر حقیقت قرآن واضح ہوتی چلی جائے گی۔

الفاظ ہماری فکر کے تقدیری پیمانے ہیں اور فکر ہمارے عمل کا سرچشمہ، یوں تو زبان بھی تاریخی عمل کی پیداوار ہے اور لسانی تبدیلیاں اس کے تغیر پذیری کے رجحان کی غماز، لیکن معانی کا مسئلہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ لفظ کے اظہاری امکانات اسے لغوی معانی کی حدود سے نکال کر اعتباری اور مجازی معانی کی سطح پر لے آتے ہیں۔ اعتبار اور مجاز دراصل استعارے کا سفر ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ ذہن انسانی الفاظ کو منطقی اور لغوی لزوم سے نجات دلا کر انہیں برتر حقائق کے انکشاف کا ذریعہ اور ترجمان بنانا چاہتا ہے۔ اعتبار و مجاز کا یہ عمل عہد بعہد تبدیلیوں سے روشناس ہوتا رہتا ہے، لیکن تمام اعتباری اور مجازی معانی کی عمر یکساں نہیں ہوتی۔۔۔۔ تہذیبی، تاریخی اور نفسی عوامل الفاظ کے اعتباری اور مجازی معانی کے دائروں کو وسیع یا محدود کرتے رہتے ہیں اور ذہن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسانی اعتبار و مجاز کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہے۔

ذہن انسانی و فکر انسانی کے اس سفر کے ایک مسافر منکر قرآن علامہ رحمت طارق بھی ہیں جو ۸ ر اپریل ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے اور کم عمری میں تفسیر و تاریخ اور اصول کی کتابوں میں کافی مہارت اور دسترس حاصل کر لی تھی۔ ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۱ء مکۃ المکرمہ میں "تفسیر منسوخ القرآن" کے نام سے قرآن پاک کی تفسیر لکھی۔ بعد ازاں ۱۹۷۶ء تا ۱۹۸۲ء مدینہ منورہ میں "تفسیر برہان القرآن" کے نام سے قرآن پاک کی تفسیر تحریر کی۔ علامہ پاکستان کے قدیم و تاریخی شہر ملتان میں رہائش پذیر رہے اور وہیں ۳ ر اکتوبر ۲۰۰۹ء کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

تصانیف

ا۔ تفسیر منسوخ القرآن، ۲۔ تفسیر برہان القرآن، ۳۔ تفسیر میزان القرآن، ۴۔ دانشوران قرآن، ۵۔ عورت اور مسئلہ امارت، ۶۔ قرآن کا معاشی نظریہ، ۷۔ قربانی کی شرعی حیثیت، ۸۔ قتل مرتد کی شرعی حیثیت، ۹۔ لباس اور چہرہ کیسا ہونا چاہیے، ۱۰۔ زمینداری، جاگیرداری اور اسلام۔

علامہ رحمت اللہ طارق کے بہت سے تفردات اور امتیازات ہیں اگر ان کا احاطہ کیا جائے تو پوری ایک کتاب درکار ہوگی، یہاں ان کے درج ذیل معرکۃ الآراء تفردات پیر ذکر خاص کئے جاتے ہیں۔

ا۔ قبلہ اول، ۲۔ نمل سے مراد، ۳۔ شہداء کے کھانے کا مسئلہ، ۴۔ منطق الطیر، ۵۔ ہد ہد، ۶۔ پہاڑوں کا چلنا، ۷۔ قربانی واجب نہیں، ۸۔ واقعہ معراج، ۹۔ چاند کے ٹکڑے ہونا، ۱۰۔ حضرت عیسیٰ کا گود میں کلام، ۱۱۔ حضرت مریم کے دستر خوان پر بے موسم پھل، ۱۲۔ حضرت مریم کی شادی، ۱۳۔ حضرت داؤد کے ہاتھ لوہا پگھلنا، ۱۴۔ موسیقی حلال یا حرام، ۱۵۔ مار کر زندہ کرنے کا عمل خداوندی، ۱۶۔ حضرت یعقوب کی بینائی، ۱۷۔ ذبح عظیم سے مراد۔

(ا) قبلہ اول / تحویل قبلہ

قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضھا. (۱)

ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کا منہ کرنا آسمان کی طرف تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلہ کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔

بیت المقدس کے متعلق عام علماء کا خیال ہے کہ یہ قبلہ اول تھا اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور اکرمؐ اپنے صحابہ اکرام کے ساتھ مسجد بنی سلمہ میں ظہر کی نماز باجماعت پڑھ رہے تھے اور دو رکعتیں ادا فرما چکے تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی، اسی وقت آپؐ نے بیت المقدس سے منہ موڑ کر کعبہ کی طرف کر لیا، صحابہ اکرام نے بھی اپنے رخ کعبہ کی طرف پھیر لئے۔ مدینہ کی دوسری مسجدوں میں بھی جہاں جہاں نماز ہو رہی تھی جب یہ حکم پہنچا دیا تو اسی لمحے تمام صحابہ کرام نے اپنے رخ پھیر لئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو تسلی دیتے ہیں کہ آپ یہود کے اعتراضات سے پریشان نہ ہوں، ان کی کتاب میں تحویل قبلہ کا ذکر موجود ہے اور انہیں خوب معلوم ہے کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ حق ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اب محض تعصب اور ہٹ دھرمی کر رہے ہیں ،اس لئے ان کے سامنے جتنے دلائل پیش کئے جائیں انہیں ہدایت نہ ہوگی۔(۲)

وجہ اعتراض یہ ہے کہ جب بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو کیا وجہ بنی کہ پھر سے قبلہ اول کی طرف رخ کرنے کو کہا گیا؟

علامہ طارق فرماتے ہیں کہ ’’بیت المقدس کی طرف نہ نبی اکرمؐ نے کبھی رخ کیا اور نہ ہی اللہ سبحانہ نے ایسا کرنے کا آپ کو حکم دے رکھا تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ ’’فتح مکہ‘‘ سے پہلے جتنے سال کعبہ اقدس مشرکین مکہ کے قبضہ میں رہا، آپؐ متفکر اور پریشان رہے کہ ’’مشرکین‘‘ نے دارالتوحید کعبہ کی کیا حالت بنا رکھی ہوگی؟ اس پر آپ کی دلجمعی اور تسلی کا سامان کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ۔۔۔ اے حبیب علیک السلام فکر نہ کرو ہم قریب ہی پھر تم کو متولی بنا دیں گے۔ اس طرح دوبارہ تولیت کعبہ کی نوید سنا کر آپؐ کے اضطراب دروں کو زائل کر دیا گیا۔(۳)

آیت کی مزید وضاحت میں علامہ طارق لکھتے ہیں کہ:

> ’’اس آیت میں نولین کا صیغہ ان تمام احتمالات کا سدباب کر دیتا ہے جو ’’تحویل‘‘ کے مفہوم کو اجاگر کرتے ہیں کیونکہ یہ لفظ متعدد معانی میں تقسیم ہے۔ جیسا قرینہ ویسے معنے بلکہ یہ قرآن ہی اسے متضاد کے طور پر نکھارتے ہیں۔ مثلاً اس کے ایک معنی رجوع اور متوجہ کرنے کے بھی ہیں لیکن قرینہ لگ جانے سے اس کے معنی ’’منہ پھیر لینے‘‘ کے بھی ہو جاتے ہیں۔ بلکہ عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس کے ساتھ ’’عن‘‘ کا صلہ ہو تو وہاں رخ پھیرنے اور توجہ ہٹانے کے معنی تعلق ہو سکتے ہیں۔ جبکہ یہاں ’’نولین‘‘ کے ساتھ ’’عن‘‘ کا صلہ ہے ہی نہیں جو ہمیں دعوت فکر دیتا ہے کہ ہم اس پر غور کریں کیونکہ اس لفظ کی وضاحت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے اگر بطور متعدی بنا دیا جائے تو اس کے معنی ’’مالک، وارث یا متولی‘‘ کے بن جائیں گے۔‘‘(۴)

اس لئے ’’نولینک‘‘ کے معنی متولی بنا دینے کے ہیں یہ نہیں کہ فی الحال تو تم بیت المقدس ہی کی طرف رخ کرو پھر کسی مناسب وقت پر تمہارا بیت المقدس سے رخ پھیر کر کعبہ اقدس کی طرف کر دیں گے؟ یہ مفہوم نہ آیات قرآنی سے مترشح ہوتا ہے اور نہ کبھی آپ کے حاشیہ خیال میں یہ بات آئی تھی۔ ’’تحریف در تحریف‘‘ اور شان نزول کی بے رحم بھول بھلیوں نے ایک سیدھی سی بات میں اشکال اور الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔(۵)

(۴) نملۃ سے مراد

> قَالَتْ نَمْلَةٌ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ. (۶)
>
> ’’ایک چیونٹی نے کہا اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں (گھروں) میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور ان کا لشکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے خبری میں تمہیں روند نہ ڈالے"

نمل سے چیونٹی مراد لی گئی ہے اور جمہور کا بھی یہی موقف ہے جبکہ جس چیونٹی نے حضرت سلیمان کے لشکر سے ڈرایا تھا وہ مذکر تھی یا مونث؟ لنگڑی تھی؟، اس کے دو بازو تھے؟، یہ چیونٹیوں کی ملکہ تھی، تورات میں لکھا ہے کہ اس کا نام منذر رہا تھا یہ یا جرمی تھا اور بعض صحائف میں لکھا ہے کہ اس کا نام اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا، حضرت سلیمان سے پہلے بھی انبیا علیہم السلام اس کو پہچانتے تھے وغیرہ وغیرہ۔(۷)

اس پر مفسرین نے بحث کی ہے جبکہ علامہ طارق فرماتے ہیں:

> "اس ترجمے کی رو سے آیت کا مفہوم واضح ہے کہ جن دنوں حضرت سلیمان کا وادی نمل سے گزر ہوا ان دنوں وہاں ایک عورت راج کر رہی تھی اور اسی نے اپنی قوم اور سپاہیوں کو مشورہ دیا تھا کہ "گھر بند" ہو کر شہر کو کھلا چھوڑ دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جنگی قوانین کی رو سے محفوظ ہو گئے بلکہ ہزاروں برس کا یہی قانون اسلامی دور میں بھی نافذ اور رائج رہا"(۸)

وہ اپنے موقف کی مزید وضاحت میں لکھتے ہیں کہ:

> "سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کے ان قبائل نے اپنا لقب "نمل" کیوں تجویز کیا؟ تو اس کا جواب قوموں کی تاریخ کے ان اتھاہ ذخیروں میں آسانی سے مل سکتا ہے جو اس طرح کے ناموں اور القاب کی وجوہات سے بھرے پڑے ہیں کہ بیشتر قومیں جانوروں کی بعض عادات و خصائل سے یا تو متاثر تھیں یا انہیں مقدس قرار دے کر اپنی ذات کو ان کے ناموں سے موسوم کر لیتی تھیں۔ عرب میں بھی قبائل کو حیوانات کے ناموں سے پکارنے کا رواج عام تھا۔ وہ ہر پسندیدہ جانور کے نام کے آگے "بنو" کا اضافہ کر کے بڑی آسانی سے حیوان سے انسان بن جاتے تھے۔ مثلاً ثعلب (لومڑی)، اسد (شیر)، نمر (چیتا)، قریش (مچھلی)، کلب (کتا)، ذئب (بھیڑیا) یعنی بنو ثعلب، بنو اسد، بنو کلب، لومڑی، شیر، چیتا اور کتا نہیں کہے جاتے کہ یہ مختلف قرائن کی وجہ سے جانور نہیں رہے، خاص کر "بنو" اور "قال" کے قرائن ان کی انسانیت پر کھلے شاہد اور گواہ ہیں"(۹)

نمل کے انسان ہونے پر قرائن و شواہد

نمل کے متعدد معنی ہیں یہاں ان سے مراد قوم نمل ہے کہ اس کے بغیر نطق اور قول کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتی اور ہم محاورات اور لسانیات کے مسلمہ اصولوں کو نظر انداز کر کے یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ قادر ہے کہ چیونٹی میں "قوت گویائی" پیدا کر دے کیونکہ اللہ کی قدرت کو خود ایجاد و ذہنی پیمانوں سے مربوط کر کے اللہ کی سنت جاریہ اور فطرت اشیاء کی نفی نہیں کر سکتے۔

(۳) شہداء کے کھانے پینے کا مسئلہ

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ.(۱۰)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کیے گئے ان کو ہرگز مردہ نہ سمجھیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزیاں دیے جاتے ہیں"(۱۱)

شہداء کی یہ زندگی حقیقی ہے یا مجازی یقیناً حقیقی ہے لیکن اس کا شعور اہل دنیا کو نہیں جیسا کہ قرآن نے وضاحت کر دی ہے۔ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ. (۱۲) پھر اس زندگی کا مطلب کیا ہے؟ بعض کہتے ہیں قبروں میں ان کی زندگی لوٹا دی جاتی ہے اور وہاں وہ اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ جنت کے پھلوں کی خوشبوئیں انہیں آتی ہیں جن سے ان کے مشام جان معطر رہتے ہیں۔ لیکن حدیث سے ایک تیسری شکل معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی روحیں سبز پرندوں کے جوف یا سینوں میں داخل کر دی جاتی ہیں اور وہ جنت میں کھاتی پھرتی اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہوتی ہیں۔(۱۳)

وجہ اعتراض یہ ہے کہ "عند" کے لفظ سے اللہ کیلئے مکانیت کا ترشح ہوتا ہے۔ یہاں "عند" کا لفظ "قرب" اور "رفع المنزلت" کا استعارہ ہے اور "رزق" کے معنی راغب وغیرہ نے "عزت وجاہ" کے لکھے ہیں یعنی شہداء کا اللہ کے ہاں اونچا مقام ہے اور ان کا نام ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔ یہ یاد رہے کہ مطلق رزق ہمارے ہاں "خوردنی اشیاء" کیلئے بولا جاتا ہے جبکہ عربی میں "دین" اور "عطائے محض" کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً فلاں کا رتبہ اللہ کی دین ہے تاہم اگر کھانے پینے کا قرینہ ہو تو اس وقت لامحالہ عربی میں بھی کھانے پینے پر اطلاق ہو جاتا ہے۔ مثلاً "لا یاتیکما طعام ترزقنہ" قبل اس کے کہ تمہارا کھانا تم تک پہنچے (یوسف:۳۷) یہاں طعام کے قرینے نے رزق کو ماکولات و مشروبات کا لباس پہنایا ہے۔(۱۴)

(۴) منطق الطیر

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنطِقَ الطَّيْرِ (نمل:۱۶)

"اے لوگو ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے"

عام علماء کا موقف یہ ہے کہ حضرت سلیمان کو بولیاں تو تمام جانوروں کی سکھائی گئی تھیں لیکن پرندوں کا ذکر بطور خاص اس لئے کیا ہے کہ پرندے سایہ کیلئے ہر وقت ساتھ رہتے تھے اور بعض کہتے ہیں صرف پرندوں کی بولیاں سکھلائی گئی تھیں اور چیونٹیاں بھی منجملہ پرندوں کے ہیں۔(۱۵)

علامہ کا موقف

"منطق الطیر دراصل جانوروں کے مزاج، خواص اور عادات معلوم کرنے کے علم کا نام ہے۔ آج یہ علم اگرچہ ترقی کی آخری منزلوں پر پہنچ پایا ہے لیکن سلیمان کے وقت کی نسبت سے یہ علم نہایت اہم دریافت تھی لہذا اسی اہمیت سے ذکر کیا گیا ہے"(۱۶)

آج اگرچہ حیوانات پر جس طرح کی ریسرچ ہو رہی ہے اور لاکھوں ڈالر کے خرچ سے مختلف فارموں میں مختلف چینلز نیشنل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جیگر اٹنگ، اینمل پلانٹ، ڈسکوری وغیرہ میں ان کی طبائع وخواص کا جائزہ لیا جارہا ہے، لیکن پہلے کا انسان بھی اس راہ پر قدم رکھ چکا تھا تاہم آج ہر نوع کے جانور کی جس طرح الگ الگ تشخیص ہو رہی ہے وہ منفرد بھی ہے اور ارتقائی حالت کی عکاس بھی۔

علامہ طارق اپنے موقف کی مزید وضاحت میں فرماتے ہیں کہ:

یہاں طیر کی مناسبت سے اس علم کو صرف پرندوں تک محدود نہیں کیا جاسکتا ہم جب چڑیا گھر کہتے ہیں تو اس سے چڑیا گھر کے ہر نوع کا جانور مراد ہوتا ہے، صرف "چڑیاں" مطلوب نہیں ہوتیں۔ یہ یاد رہے کہ طیر رسالہ فوج کو بھی کہتے ہیں اس طرح منطق، تربیت اور ٹریننگ کا استعارہ ہے۔(۱۷) علامہ طارق کے خیال میں یہ علم آپ سے پہلے لوگوں میں رائج تھا۔(۱۸) جس کی حقیقت کو دوسرے اہل علم بھی تسلیم کر چکے ہیں تفسیر "الواضح" کے مصنف علامہ محمود احمد حجازی لکھتے ہیں کہ:

> "منطق الطیر دراصل شعبہ حیاۃ الحیوان کا علم ہے جس کے ذریعہ ہر قسم کے حیوانات اور پرندوں کی بناوٹ، صورت وعادات، وصف اور خواہشات کا اندازہ کیا جاتا ہے اور وہی علم سلیمان کو حاصل تھا"(۱۹)

(۵) ہدہد

> وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَائِبِينَ(۲۰)
>
> "اور آپ نے پرندوں کی دیکھ بھال کی اور فرمانے لگے یہ کیا بات ہے کہ میں ہدہد کو نہیں دیکھتا؟ کیا واقعی وہ غیر حاضر ہے؟"

ہدہد نامی گھڑ سوار جو حضرت سلیمان کیلئے جاسوسی وخبر رسانی کرتا اور محافظ بھی تھا اس کو پرندہ بنا دیا گیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں پر ان لوگوں کو مغالطہ لگ گیا ہے۔ معراج جولغت کی کتاب ہے اس میں لکھا ہے اسی نام کا یمن میں ایک قبیلہ ہے (جلد اول مطبع نول کشور) قبیلہ نہ ہو تو بھی انسان ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کیونکہ شام نعلے کا ایک مشہور سردار ہے جسے عاشور کے بادشاہ (۸۵۹ ق م تا ۸۲۴ ق م) نے جنگ "قرقر" میں مار بھگایا تھا اس کا نام بھی ہدہد تھا۔(۲۱)

الغرض تاریخ نے اتنے انسانی ہدہدوں کو محفوظ کر رکھا ہے کہ ان کی موجودگی میں سلیمان کے ہدہد کو پرندہ کہنا حقیقت کا مذاق اڑانا ہے(۲۲) شریعت کا مکلف ہمیشہ ذی شعور اور ذی عقل ہوتا ہے اسی ضمن ہدہد کے حوالے سے علامہ لکھتے ہیں:

> "جس ہدہد کو نہ پاکر حضرت سلیمان نے جس طرح غیض وغضب اور خفگی کا اظہار فرمایا تھا وہ یہی لکڑی کو چونچ مار کر سوراخ کرنے والا چوب تراش (Woodi wood Peekr) پرندہ نہیں تھا۔ وہ ذی شعور، ذی عقل، شریعت وقانون کا مخاطب انسان ہی تھا کہ انسانوں ہی کی غلطی یا کوتاہی پر تادیبی تازیانہ رسید کیا جاسکتا ہے۔ حیوانات جو عقل وشعور کے تکلفات سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ انہیں ڈرانے، دھمکانے کا انسانی انداز اختیار کیا جاسکتا اس سے معلوم ہوا کہ سلیمان کا روئے سخن کسی پرندے کا نہیں تھا اپنے کسی بااعتماد سپاہی کی طرف تھا"(۲۳)

یہاں پر قابل غور بات یہ ہے کہ آیت بالا میں لا عذبنہ عذاباً شدیداً اور لا اذبحنہ کے الفاظ آئے ہیں۔ عذاب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شدید تو کسی انسان پرندے یا جانور کے ساتھ ہوتا ہے لیکن ذبح کرنا صرف پرندوں اور جانوروں کے ساتھ مربوط ہے اور اللہ تعالیٰ کے کسی نبی کے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی انسان کو ذبح کرنے کا ارادہ یا لفظ استعمال کرے۔

(۶) پہاڑوں کے چلنے سے مراد

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ (۲۴)

''اور آپ پہاڑوں کو اپنی جگہ جمے ہوئے خیال کریں گے لیکن وہ بھی بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے''

اس ضمن میں یہ موقف بیان کیا جاتا ہے کہ ایسا قیامت والے دن ہوگا کہ پہاڑ اپنی جگہ پر نہیں رہیں گے بلکہ بادلوں کی طرح چلیں اور اڑیں گے اس کے بعد اچانک ایسا جھٹکا ہوگا کہ پاش پاش ہو جائیں گے۔

یہاں اعتراض یہ ہے کہ اگر پہاڑ چلتے تو ٹکرا کر خود بھی پاش پاش ہو جاتے اور دنیا بھی کبھی کی خرابات میں شمار ہو جاتی۔

علامہ طارق فرماتے ہیں:

''پہاڑ زمین کا حصہ ہیں اور زمین بھی چلتی رہتی ہے ہم اس کے وسیع وعریض سطح پر آباد ہیں اور اس کا چلنا محسوس نہیں کرتے۔ سمندر میں بھی جہاز چلتا رہتا ہے اس میں بھی ایک شہر آباد ہوتا ہے کوئی سویا ہوا ہے کوئی کام میں لگا ہوا ہے، دکانیں ہیں، چہل پہل ہے مگر ہم جہاز کا چلنا محسوس نہیں کرتے اور پورے سکون سے ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں شمس وقمر و دیگر عظیم وجسیم ہر ایک کی حرکات کا ذکر ہے''(۲۵)

ادھر یہ بھی حقیقت ہے کہ کھربہا سال پہلے زمین اور چاند ایک ہی جسم سے تعلق رکھتے تھے بعد میں الگ ہو گئے تاہم دونوں کے خواص آج بھی ملتے جلتے ہیں، چاند اگر اپنے ''محور'' میں محوِ حرکت ہے (کل فی فلک یسبحون) تو زمین کے محوِ گردش ہونے میں کونسی چیز مانع ہے۔ ہم اگر اس کی بڑی جسامت کے باعث حرکت محسوس نہیں کرتے تو اس سے حرکت کی نفی نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ جبال کے مفہوم میں ایک اور توجیہ بھی پیش کی جا سکتی ہے جو لغت اور استعمالاتِ عرب کی رو سے قوم کے وڈیروں، سربرآوردہ شخصیتوں اور قبائل کے سرداروں کو بھی جبال ٹھہراتے ہیں بلکہ قرآن پاک میں بے شمار مقامات پر جبال کے معنی ہی سرداران قوم ہے۔ اب معنی صاف ہو گئے کہ جن لوگوں کو تم مضبوط اور اپنے حاکمانہ خطے کے ساتھ جما ہوا اور مستحکم سمجھتے ہو ان کی حیثیت بھی چلتے بادلوں کی سی ہے ذرا انقلاب کی ہوا چلی یہ بل گئے۔(۲۶)

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا ○ فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ○ لَا تَرَى فِيهَا عِوَجًا وَلَا أَمْتًا ○ (طٰہٰ: ۱۰۵تا۱۰۷)

''علامہ طارق ترجمہ یوں کرتے ہیں: یہ لوگ آپ سے بڑے لوگوں کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ ان کا کیا ہوگا؟ تو انہیں بتلا دیجئے کہ میرا رب ان کی توانائی کو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اچھال دے گا۔ تب دیکھو گے کہ سرزمین ذہن صاف وہموار میدان کی طرح ہوگی نہ کہیں کجی ہوگی نہ اونچ نیچ''(۲۷)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۷) قربانی واجب نہیں

علامہ طارق قربانی کو واجب نہیں سمجھتے بلکہ سنت کی حیثیت دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ قرآن واحادیث اور سلف سے استدلال کرتے ہیں۔ علامہ مجتہد امام علی بن حزم اندلسی کا قول نقل کرتے ہیں کہ "لایصح عن احد من الصحابة ان الضحية واجبة" (۲۸) یعنی قربانی کا وجوب کسی ایک بھی صحابی سے علمی بنیادوں پر ثابت نہیں ہے۔

علامہ کے خیال میں قربانی صرف مکہ سے مربوط ہے ساری دنیا سے نہیں۔ سورہ بقرہ کی آیت (۱۹۶) کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مکہ سے باہر احرام تو کھول سکتے ہو مگر قربانی نہیں کر سکتے قربانی بہر صورت وہاں بھجوانی ہوگی بات یہ ہوئی کہ قربانی مکہ سے باہر دنیا کے کسی بھی حصہ میں نہیں ہو سکتی (۲۹) فقیہ اسلام حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں (بحذف اسناد) "الاضحية سنة" یعنی قربانی واجب نہیں سنت ہے۔ (۳۰)

قربانی کے وجوب کے متعلق عام علماء کا موقف یہ ہے کہ سورۃ الکوثر کی آیت کریمہ فصل لربک وانحر سے قربانی کا وجوب مستنبط ہے اور نحر کے معنی لغت میں قربانی کرنے کے آئے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے جبکہ علامہ طارق نے ابن حزم ظاہری کے حوالے سے لفظ "نحر" کے معنی "سینے پر ہاتھ باندھنے" کیلئے ہیں۔

علامہ طارق اپنے موقف کی وضاحت میں مزید فرماتے ہیں کہ:

"سورہ کوثر قرآن پاک کی ان سورتوں میں سے ہے جو مکہ میں اسلام کے ابتدائی دور میں نازل ہوئیں۔ اس وقت قربانی تو ایک طرف مسلمانوں پر فرضیت حج کا سوال بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ کیا حج سے پہلے بھی قربانی کا حکم ممکن ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ "وانحر" کا تعلق حج والی قربانی سے نہیں ہے۔ اس میں یہ ذہن نشین کرایا گیا ہے کہ جو بھی ذبیحہ ہو صرف اللہ کی ذات کیلئے ہو جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (انعام: ۱۶۲) میرا قیام، صلوۃ، میرا ذبیحہ و دیگر عبادات بلکہ میرا جینا اور مرنا سب ذات خداوندی کیلئے ہے۔ اس طرح یہاں نحر کو عام میں شمار کر کے حج والی قربانی سے غیر مربوط کر دیا ہے۔ (۳۱)

(۸) واقعہ معراج

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ.

"پاک ہے وہ اللہ تعالیٰ جو اپنے بندے (رسول) کو رات ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے" (۳۲)

اس آیت کے ضمن میں عام موقف تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے راتوں رات اپنے بندے (رسول اکرمؐ) کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی اور پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانی سفر بھی ہوا (جس کی تفصیل احادیث میں ملتی ہے)، واقعہ معراج بھی اسی آیت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حوالے سے بیان کیا جاتا ہے۔

جبکہ علامہ طارق کہتے ہیں کہ اگر اسی آیت کے ساتھ ''ثم عرج بہ الی السماء'' کے الفاظ ہوتے تب تو معراج کی بات ہو سکتی تھی یہاں صرف بیت الحرام اور بیت المقدس کی عظمت و اہمیت واضح کرنا مقصود تھی۔ خاص کر مکۃ المکرمہ کی جو نبی اکرمؐ کا مسکن تھا اور بیت المقدس اہل کتاب کا محب۔ مقصود اشارہ اسطرح ہوا کہ شرق اوسط کے دونوں ادیان میں قربت پیدا کرنے اور خیر سگالی کے اظہار کیلئے نبی اکرمؐ پہل کریں کیونکہ وہ دو امتوں کے مابین حائل نفرتوں کی دیوار گرانے کا یہی نفسیاتی وسیلہ تھا جو صاحب لطف و کرم ہمارے آقا محمدؐ نے استعمال فرمایا اور اپنے شیوۂ پیغمبری کے مطابق قربتوں کے محل تعمیر کئے اور نفرتوں کے حصار پیوست زمین کرڈالے۔

''بارکنا حولہ'' کی تلمیح واضح کرتی ہے کہ شام کا پورا علاقہ جس میں بیت المقدس بھی شامل تھا سرسبز و شاداب، ہر قسم کے پھل، باغات اور اناج وغیرہ کی نعمتوں سے مالا مال اور تجارت کی غرض سے نبی اکرمؐ متعدد بار ادھر کا سفر بھی کر چکے تھے اور اس خطے سے آپ کو بڑی مانوسیت ہو گئی تھی۔ آپؐ جاگتے اور خواب میں اس علاقے کو بھلا نہ سکتے تھے۔ (۳۳)

(۹) عورت حکمران بن سکتی ہے

عورت کی امارت کا مسئلہ ہمیشہ ہی سے موضوع بحث رہا ہے۔ جمہور کے نزدیک عورت حکمران نہیں بن سکتی۔ مسلم معاشرے میں عورت کی سیاسی اور فوجی قیادت تسلیم نہیں کی جاتی اور اس ضمن میں بخاری شریف کی مندرجہ ذیل حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔

قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امراتھم۔

''وہ قوم کبھی کامران نہیں ہو سکتی جس نے کسی عورت کو والی بنایا۔ (بخاری۔ حاشیہ سندی طبع میمنہ مصر ۱۳۰۶ھ جلد ۳)

لیکن علامہ طارق نے تحقیق سے واضح کیا ہے کہ یہ حدیث کسی بھی طرح صحیح درجہ کی نہیں ہے اور یہ روایت ربع صدی بعد تک صحابہ کرام سے پوشیدہ رہی اور جنگ جمل میں جو حضرت علی کی فوج تھی اس میں ۲۰ ہزار افراد تھے جبکہ حضرت عائشہ کے حامیوں کی تعداد ۳۰ ہزار تھی۔ اس موقع پر بھی کسی نے یہ حدیث بیان نہیں کی۔ (۳۴) ان تمام لوگوں میں سے صرف ایک ابوبکرہ نامی صحابی نے یہ روایت بیان کی جو حضرت علی کی حمایت میں تھے۔

علامہ کے خیال میں اس وقت یہ حدیث بیان کرنے کا مقصد گہری سازش کو جنم لینا تھا اور سماج بھی عورت کی سربراہی کو تسلیم نہیں کرتا۔ علامہ طارق مزید اپنے موقف کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

''قرآن نے اپنے ماننے والوں کو عورت کی سربراہی کی بنیاد فراہم کر دی ہے اور وہ قتل مسیح کے دو واقعات اور سورہ آل عمران کی آیت ۱۱۰ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عورت کی حکمرانی و قوت ارادی کو زندہ حقیقت کے طور پر سامنے لے آتے ہیں۔ اس طرح اس نظریہ کی تشفی ہو جاتی ہے کہ عورت ناقص العقل والدین

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے یا سر براہی کیلئے غیر موزوں ہے۔"(۳۵)

علامہ نے تاریخ اسلام کی ان خواتین کا تعارف بھی پیش کیا ہے جن کی نہ صرف اطاعت کی گئی بلکہ ان کے نام کے سکے ڈھالے گئے اور خطبے بھی پڑھے گئے مگر ان ممالک میں نہ تو تباہی و بربادی نازل ہوئی اور نہ ہی کوئی مذہبی فلسفہ زوال پذیر ہوا۔ (تفصیل کیلئے علامہ طارق کی برہان القرآن (ص:۳۱۶، ۳۲۱) میں قیادت نسواں کا مسئلہ دیکھا جاسکتا ہے)

(۱۰) چاند کا ٹکڑے ہونا

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ. (قمر:۱)

"قیامت قریب آ گئی اور چاند پھٹ گیا"(۳۶)

جمہور سلف وخلف کا یہ مسلک ہے کہ یہ معجزہ ہے جو اہل مکہ کے مطالبے پر دکھلایا گیا، چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے حتیٰ کہ لوگوں نے حرا کو اس کے درمیان دیکھا یعنی اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کے اس طرف اور ایک ٹکڑا اس طرف ہو گیا۔(۳۷) جبکہ امام ابن کثیر لکھتے ہیں کہ علماء کے درمیان یہ بات متفق علیہ ہے کہ انشقاق قمر آپؐ کے زمانے میں ہوا اور یہ آپ کے واضح معجزات میں سے ہے، صحیح سند سے ثابت اور احادیث متواترہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔(فتح القدیر)

علامہ طارق کا اس آیت کے ضمن میں یہ موقف ہے کہ:

> "الساعۃ" کا لفظ مبہم نہیں ہے۔عربی میں ہر ناگوار اور مصیبت بدوش گھڑی پر الساعۃ کا اطلاق ہوا ہے اسے دانستہ مبہم بنا کر یا تو قیامت سے موسوم کیا گیا ہے یا مشہور "دیومالائی" قصہ "شق القمر" سے جبکہ چاند پھٹنے کا خود اختراعی مفہوم تاریخ اور قوانین فطرت کے تناظر میں کسی وجود کی حقیقت نہیں رکھتا کہ عربوں کے ہاں بھی شق القمر مصیبت کے نازل ہونے سے تعبیر ہے کہ ان کے نزدیک مصیبت کا نزول اوپر ہی سے تصور کیا جاتا ہے اس طرح کبھی تو وہ کہتے کہ آسمان کا ٹکڑا گرا اور کبھی کہتے کہ چاند پھٹ گیا وغیرہ۔(۳۸)

مزید برآں علامہ کہتے ہیں:"یہاں چاند پھٹنے کو جنگ بدر کا نتیجہ قرار دیا ہے کہ بدر اور احد ہی میں ان کی طاقت ریزہ ریزہ ہوگئی اور پھر ان پر شکست کے پیہم نزول سے مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور اس طرح قمر میں تینوں مقامات پر الساعۃ کا لفظ اس ناگوار گھڑی سے تعبیر ہے جو مخالفین کے سروں پر مصیبت بن کر نازل ہوگئی اور شق القمر حقیقت بن گئی۔"(۳۹)

(۱۱) حضرت عیسیٰ کا گود میں کلام کرنا

قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا (مریم، آیت:۲۹)

"لوگ کہنے لگے ہم کیسے بات کریں اس سے جو گہوارہ میں (کمسن) بچہ ہے"(۴۰)

اس آیت سے یہ مراد لیا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس وقت کلام کیا جب وہ شیر خوار تھے اور دودھ پی رہے تھے لوگوں کی باتیں سن کر آپ نے دودھ پینا چھوڑ دیا اور ان لوگوں کی طرف رخ کر کے یہ کلام معجز نظام ارشاد فرمایا سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں نہ میں خدا ہوں اور نہ خدا کا بیٹا(۴۱)

© rasailojaraid.com

جبکہ علامہ طارق کا خیال کچھ اس طرح ہے:

"یہاں کان کا فعل برائے ماضی ہے یہود کے احبار و رہبان جس چادر میں دھت ہو کر مسیح کو منہ لگانا نہیں چاہتے تھے ان کو اپنے علم کے گھمنڈ کے علاوہ اپنی عمر کا پندار بھی تھا کہ ہم علم و عمر میں بزرگ ہو کر مسیح جیسے کم عمر اور ابھی تک گود میں رہنے والے بچے سے کلام کریں یہ تو ہمارے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ غرض کہ مسیح بالکل ہی پنگوڑے کے بچے نہیں تھے جب احکام ملے تو ہدایت یافتہ تھے" (۴۲)

(۱۲) عمر نوح کا مسئلہ

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ فَلَبِثَ فِيهِمْ أَلْفَ سَنَةٍ إِلَّا خَمْسِينَ عَامًا (۴۳)

اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان میں ساڑھے نو سو سال تک رہے۔ (۴۴)

قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے یہ ان کی دعوت و تبلیغ کی عمر ہے۔ ان کی پوری عمر کتنی تھی؟ اس کی صراحت نہیں کی گئی بعض کہتے ہیں چالیس سال نبوت سے قبل اور ساٹھ سال طوفان کے بعد اس میں شامل کر لئے جاتے ہیں۔ (۴۵)

اس آیت میں انسانی عمر کی درازی اس حد تک غیر معمولی بتائی گئی ہے جو تجربے اور مشاہدے میں نہ آنے والی ہے۔ خاص کر دوسرے مقام پر اتنی طبعی عمر کی نفی موجود ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ لَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا اللَّهُ (۴۶)

"کیا تم کو ان لوگوں کے حالات کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے تھے یعنی قوم نوح قوم عاد اور قوم ثمود اور جو ان کے بعد میں آئے کہ جن کے حالات اور کوائف کا علم صرف خدا کو ہے"

اس ضمن میں علامہ طارق کہتے ہیں کہ طوفان نوح کے بعد جب مہینوں کے ایام کا تعین ہوا تو ہر ماہ کیلئے ۲۴ دن قرار پائے یعنی اس طرح سال ۳۶۵ دن کی بجائے ۲۸۸ دن تک مختصر ہوتا تھا اس طرح ان مختصر سالوں کا مجموعہ ۷۴۰ سال ہوتے ہیں.... دوسرے الفاظ میں طوفانی سن کے مطابق سیدنا نوح کی عمر ۷۴۰ سال بن جاتی ہے لیکن میرے علم میں یہ تو ہے کہ بعض اقوام کا مہینہ ۱۹ دن کا ہوتا تھا مگر میرے پاس اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ اتنے ہی دنوں کا مہینہ سن طوفانی کے بعد استعمال ہوتا بھی تھا۔ چنانچہ علامہ پرویز کی طرح میرا بھی یقین ہے کہ آگے چل کر شاید سائنس ماہ و سال کا تعین کر کے اس مسئلہ پر پڑے ہوئے غبار کو چھٹا دے گی۔ (۴۷)

(۱۳) حضرت سلیمان کی لاٹھی

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ (۴۸)

"پھر جب ہم نے ان کیلئے موت کا حکم صادر کیا تو کسی چیز نے بھی ان کی موت کی خبر نہ دی مگر گھن کے کیڑے (دیمک) نے دی جو ان کے عصا کو کھا رہا تھا"

© rasailojaraid.com

روایتی نکتۂ نظر یہ ہے کہ حضرت سلیمان کے زمانے میں جنات کے بارے میں مشہور ہوگیا تھا کہ یہ غیب کی باتیں جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کی موت کے ذریعے سے اس عقیدے کے فساد کو واضح کر دیا۔(۴۹)

اس ضمن میں علامہ رحمت اللہ طارق اپنا تنقیدی نکتۂ نظر بیان کرتے ہیں کہ:

> ''حضرت سلیمان علیہ السلام مہینہ بھر بلکہ ایک سال تک لاٹھی کے سہارے کھڑے رہے جبکہ اس اثناء میں ہزاروں، سینکڑوں مرتبہ کھانے پینے اور رفع حاجت کے محتاج رہے ہوں گے، رقیبوں نے تخت پر چڑھ جانے کی کوشش کی ہوگی، ریاستوں نے بغاوت اور شرارت کی سوچی ہوگی، علاوہ اس کے کہ آپ حاکم وقت بھی تھے اور حقوق العباد متقاضی تھے کہ ان کے معاملات اور دادرسی کیلئے زیادہ وقت نکال لیں، یہ کیا کہ تمام وقت مصروف عبادت رہ کر ''ہمالیہ'' جتنی ذمہ داریں سے تغافل برت لیں؟ پھر یہ کتنی غلط اور توہین آمیز بات ہے کہ آپ کی لاش کی ''بے حرمتی'' ہوئی اور زمین پر گر پڑی؟ اور ایک سال تک دفن بھی نہ کی جا سکی''(۵۰)

یہاں جس حقیقت کو استعارے اور مجاز کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ''دابۃ الارض'' کنایتاً حضرت سلیمان کے جانشین بننے والے بیٹے ''رجعام'' کو کہا گیا ہے اور ''منسأۃ'' لاٹھی کو بھی کہتے ہیں اور ادبیات عرب کی رو سے اس سے مراد حکومت اور پاور ہے۔ اس طرح ''جن'' سے وہ قومیں مراد ہیں جو ''غیر اسرائیلی'' تھیں اور اسرائیل کی غلام بھی۔ اس بناء پر علامہ کے نزدیک آیت کا مفہوم یوں ہوا کہ:

> ''جب ہم نے سلیمان پر موت کو مسلط کیا تو اسے پوشیدہ رکھا گیا کہ بسا اوقات نئی حکومت قائم ہونے تک ایسا کرنا پڑتا ہے اور کسی نے ان کی موت کی خبر نہ دی مگر رجعام کی جانشینی کے اعلان نے جو (دراصل نااہل تھا اور اندر ہی اندر سے) اس کی حکومت کو کھا رہا (یعنی کمزور کر رہا) تھا۔ اس طرح جب سلطنت کی گرتی دیواریں (سب پر خاص کر) غیر اسرائیلی غلاموں پر عیاں ہوگئیں تو وہ افسوس کرنے لگے کہ کاش انہیں اس راز کا پہلے سے پتہ چل جاتا تو وہ مزید کسی رسوا کن غلامی کا دکھ نہ سہتے۔(۵۱)

(۱۴) حضرت مریم کے دسترخوان پر بے موسم پھلوں کی بہتات

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَـٰذَا (۵۲)

''زکریا جونہی مریم کے کمرے میں داخل ہوتے تو اس کے پاس رزق پایا، پوچھا کہ مریم یہ کہاں سے ہے؟''

اس آیت کے ضمن میں جمہور لکھتے ہیں کہ محراب سے مراد حجرہ ہے جس میں حضرت مریم رہائش پذیر تھیں اور رزق سے مراد پھل ہیں۔ یہ پھل ایک تو غیر موسمی ہوتے کہ گرمی کے پھل سردی کے موسم میں اور سردی کے پھل گرمی کے موسم میں ان کے کمرے میں موجود ہوتے، دوسرا یہ کہ حضرت زکریا یا کوئی اور شخص لا کر دینے والا نہیں تھا اس لئے حضرت زکریا نے از راہ تعجب و حیرت پوچھا کہ یہ کہاں سے آئے؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علامہ طارق کہتے ہیں کہ قرآن پاک نے روٹی کا ذکر کیا ہے نہ ہی بے موسم پھلوں کا۔ اسی طرح بات تفلوں کا ذکر نہ قرآن نے کیا ہے نہ ہی کسی حدیث میں اشارہ ہے۔ بات صاف ہے کہ سیدہ کے پاس کوئی غیر معمولی رزق نہیں تھا اور نہ ہی حضرت زکریا نے کسی غیر معمولی چیز کو پا کر ہی انی لک ھذا کہا تھا؟ (۵۳)

عربی میں رزق کے معنی لازمی طور پر کھانے پینے کے ہیں۔ امام راغب نے عطاء جاری کہہ کر اسے عام کر دیا ہے بلکہ ایک آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ای من المال و الجاہ و العلم" مال ہو، جاہ ہو یا علم (حال ہو خواہ مستقبل میں) اس پر رزق کا اطلاق ہوا ہے۔ (۵۴)

جبکہ رہبانیت کی تاریخ بتلاتی ہے کہ ایسی عبادت گاہوں میں گوشہ نشینی کرنے والے نفس کشی اور بھوک کی زیادہ سے زیادہ عادت بناتے اور لذات دنیوی سے دور رہتے بصرف عرفان وگیان کی منزلیں طے کرنے میں لگے رہتے تھے۔ ایسے میں زکریا نے "حضرت مریم" کا ذہنی ارتقاء معلوم کرنے کیلئے دریافت کیا کہ بیٹی یہ سب کون کر رہا ہے؟ جواب ملا کہ اللہ اور حضرت مریم کے اتنے کہنے سے زکریا اس کے "ذہنی بلوغ" اور ارتقاء کا اندازہ کر گئے کہ بہت بلندیاں عبور کر چکی ہیں کیونکہ جو شخص اللہ تعالیٰ کیلئے اور اس کے قوانین کی خدمت کیلئے زندگی وقف کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کیلئے ظاہری رزق کا بھی سامان بھی کر دیتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی اچنبھے کی بات ہے اور نہ ہی بغیر محنت کے صلہ کا اجراء، اور اگر محنت بغیر صلہ کا اجراء لامحالہ اور ضروری ہوتا اور روٹی بغیر اسباب کے ملتی تو یہ کتنی بے مروتی ہوگی کہ مریم کو تو بغیر سبب کے ملتی رہی اور بقول واعظ حضرات سرور کائنات شکم مبارک پر پتھر باندھنے یا کسی بھاری چیز کا سہارا لینے پر مجبور ہو جائیں؟

لیکن ہم جانتے ہیں کہ اگر کہیں بغیر سبب کے روٹی مل بھی ہے تو دوسرے موقع پر سبب کا سہارا لے کر حاصل کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں ہے بی بی صاحبہ علیہا السلام جب درد زہ جیسی نازک صورت سے دوچار ہوئیں اس وقت بھی بھوک مٹانے کیلئے حکم ہوا۔ وھزی الیک بجذع النخلۃ (مریم:۲۵) ترجمہ: کھجور کے تنے کو جھٹکے دو تازہ کھجوریں گر پڑیں گی۔ یہاں "بجذع" میں لفظ با "سببیہ" ہے جس سے حقیقت حال کا بخوبی احساس کیا جا سکتا ہے۔ (۵۵)

(۱۵) حضرت مریم علیہا السلام کی شادی

جمہور مفسرین کے نزدیک سیدہ مریم کے ہاں حضرت عیسیٰ کی پیدائش معجزاتی طور پر بن باپ کے ہوئی یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ سیدہ مریم کی شادی نہیں ہوئی اور لفظ "احصنت فرجھا" سے صرف پاک دامنی مراد لیتے ہیں جبکہ علامہ طارق کہتے ہیں کہ: "احصنت فرجھا" کا اطلاق صرف غیر شادی شدہ پر ہی نہیں ہوتا بلکہ شادی شدہ پر بھی ہوتا ہے۔

علامہ عربی لغات کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ لغت عرب کے دانشور اور حکمت قرآن کے بالغ نظر مفکر امام محمد عبدہ (۱۹۰۵ء) احصان کے مفہوم میں لکھتے ہیں:

یقال احصنت المرأۃ اذا تزوجت لانھا تکون فی حصن الرجل و حمایتہ.

"عورت جب شادی کرتی ہے تو عرب کہتے ہیں "احصنت المرأۃ" وہ شادی کر کے شوہر کی حفاظت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں آ کر تمام خطرات سے محفوظ ہو گئی ہے'' (۵۶)

اسی طرح وہ لکھتے ہیں کہ بچھ لوگ انبیاء (آیت نمبر ۱۹) والتی احصنت فرجھا فنفخنا فیھا من روحنا اور سورہ تحریم (آیت نمبر ۱۲) ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجھا فنفخنا فیه من روحنا میں واقع لفظ ''نفخ'' سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ کے روح پھونکنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت مسیح کی ولادت غیر معمولی ہے اس کے تناظر میں مریم کا حاملہ ہونا بھی غیر معمولی تھا لیکن ہم سب کو نہیں جو ''نفخ روح'' کے استعارے کو زندگی ودیعت کرنے کے علاوہ کسی غیر معمولی مفہوم میں استعمال کرتا ہو یا یہ سمجھتا ہو کہ اللہ کے روح ڈالنے سے ہر فرد بے پدر فرزند بن جاتا ہے؟ اگر روح ڈالنے کے کا رموز کو اسی رنگ میں تسلیم کر لیا جائے جس مفہوم میں ''متعصب پرست'' پیش فرماتے ہیں تو ہماری بہو، بیٹیوں کی غلط کاری کی اولاد کو بے پدر ہونے کے طعن سے نہ تو مجروح کیا جا سکے گا اور نہ ہی ''آوارہ'' خواتین کے کردار کو سرزنش اور سزا کا سزاوار ٹھہرایا جا سکے گا۔ (۵۷)

تاریخ اور اناجیل سے پتہ لگتا ہے کہ سیدہ مریم کے شوہر ان کے عم زاد (کزن) یوسف نجار ظاہر کئے گئے ہیں اور سیدہ مریم حمل کے آخری ایام میں جب باہر آئیں اور (بقول مفسرین) مصر چلی گئیں تو حضرت زکریا کی بجائے یوسف نجار کے ہمراہ ہی ہم سفر ہوئیں اور بات واضح ہو گئی کہ سیدہ اور یوسف کا باہمی ازدواجی تعلق تھا کہ اس کے بغیر ''عفیفہ'' نہ تو کسی اجنبی کو ہم سفر بنا سکتی ہے اور نہ ہی زکریا کی موجودگی میں ''خلوت وجلوت'' میں کسی کو محو راز و مونس ٹھہرا سکتی ہیں۔ (۵۸)

(۱۶) حضرت داؤد کے ہاتھ میں لوہا پگھل جاتا تھا

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُودَ مِنَّا فَضْلًا يَا جِبَالُ أَوِّبِي مَعَهُ وَالطَّيْرَ وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ (۵۹)

اور ہم نے داؤد پر اپنا فضل کیا۔ اے پہاڑو اس کے ساتھ رغبت سے تسبیح پڑھا کرو اور پرندوں کو بھی اور ہم نے اس کیلئے لوہا نرم کر دیا کہ تو پوری پوری زرہیں بنا لو جوڑوں میں اندازہ رکھو تم سب نیک کام کیا کرو۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد کو نبوت کے ساتھ بادشاہت اور کئی امتیازی خوبیوں سے نوازا جن میں ایک حسن صوت کی نعمت تھی، جب وہ اللہ کی تسبیح پڑھتے تھے تو پتھر کے ٹھوس پہاڑ بھی تسبیح خوانی میں مصروف ہو جاتے، اڑتے پرندے ٹھہر جاتے اور زمزمہ خواں ہو جاتے، دوسرا لوہے کو آگ میں تپاتے اور ہتھوڑے سے کوٹے بغیر اسے موم، گوندھتے ہوئے آٹے اور گیلی مٹی کی طرح جس طرح چاہتے موڑ لیتے، بٹ لیتے اور جو چاہتے بنا لیتے اور اس لئے آپ کو ''سابغات'' یعنی پوری لمبی زرہیں بنانے کا حکم تھا تاکہ جوڑنے والے کے پورے جسم کو صحیح طریقے سے ڈھانپ لیں اور اسے دشمن کے وار سے محفوظ رکھیں۔ (۶۰)

علامہ طارق لکھتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو تین چیزوں کی برتری عطا کی گئی۔

(۱) بڑے بڑے سرداروں کا زور توڑ کر ان کے تابع بنایا گیا۔

(۲) آپ کی افواج میں رسالہ فوج کا اضافہ کیا گیا۔

(۳) آپ کا زمانہ فتوحات اور جنگوں کا زمانہ تھا لہٰذا زرہ سازی اور لوہا پگھلانے کا علم عطا کیا گیا۔

اس طرح سرداروں کو ''جبال'' کے استعارے میں اور رسالہ دستوں کو ''طیر'' کے روپ میں اور صنعت فولاد کو ''النا'' کی شکل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں پیش کر کے تعبیر کے نہایت نفیس اسلوب کو کام میں لایا گیا ہے۔(۶۱)

علامہ فرماتے ہیں:

> ''النا'' کے لفظ کو مفسرین نے جس بے رحمی سے پگھلنے یا حضرت داؤد کے ہاتھ پر ''موم'' کی طرح نرم پڑ جانے کے مفہوم میں استعمال کیا ہے اس کی سند نہ قرآن پاک میں ہے اور نہ کسی محاورہ عرب میں، اب رہا معجزہ تو اس کا جواب یہیں سے مل جاتا ہے کہ یہاں ''النا'' کے فاعل خود ذات باری تعالیٰ ہیں یعنی اگر معجزاتی مفہوم لیا جائے تو بھی فاعل کی حیثیت سے لوہے نرم کرنے والا ''دست قدرت'' تھا بلکہ دست داؤد اور ''دست قدرت'' نے ہر کام اسباب سے مربوط کر رکھا ہے کہ اسی کا نام سنت اللہ ہے اور پھر لوہے کو پگھلانے اور ڈھالنے کی غرض وغایت قرآن نے خود ہی بتلا دی کہ وعلمناہ صنعۃ لبوس لکم لتحصنکم من بأسکم. (انبیاء:۸۰)ترجمہ:اور ہم نے داؤد(وسلیمان ہر ایک)کو زرہ سازی کی صنعت کا علم دیا تاکہ یہ زرہیں تم کو لڑائی کے ضرر سے بچائے رکھیں''

یہاں ''علمناہ'' اور ''صنعۃ'' کے الفاظ قابل غور ہیں کہ یہ علم ''ٹیکنالوجی'' ''سائنس'' کا غماز ہے اس کے معنی جاننے اور اشیاء کی ماہیت سے آگاہی حاصل کرنے کے ہیں جو خالصتاً تدریجی چیز ہے۔ اسی طرح ''صنعۃ'' کا لفظ واضح کرتا ہے کہ ''فولاد سازی'' نے صنعت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کے کارندے اس میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور نہ صرف زرہیں بلکہ آرائشی محرابیں، بڑے بڑے مجسمے اور اونچی اونچی دیگیں وغیرہ بھی بناتے تھے اور صنعت فولاد صرف زرہ سازی تک ہی محدود نہیں تھی، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

> يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَاءُ مِن مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُورٍ رَّاسِيَاتٍ. (سبا:۱۳)
>
> ''اور یہ جفاکش محنتی لوگ جو سلیمان کے تابع ہو چکے تھے سلیمان جو چاہتے ان کیلئے بنا لیتے تھے یعنی قلعے، مجسمے، تالاب جیسے بڑے بڑے لگن اور (اونچی) دیگیں (جو وزنی ہونے کی وجہ سے) ایک ہی جگہ پر رکھی رہتی تھیں''

علامہ کے خیال میں یہاں ''یعملون'' میں ایک بلیغ اشارہ ہے کہ ان اشیاء کے بنانے والے ''حضرت سلیمان علیہ السلام'' کے کارندوں کو بتلایا گیا ہے۔ یعنی لوہا پگھلانے اور ڈھالنے کے ''فاعل'' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے کارندے اور کام کرنے والے عمال ہی تھے۔(۶۲)

(۱۷)موسیقی حلال یا حرام؟

> وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ(۶۳)
>
> ''لوگ ایسے بھی ہیں جو ناٹک کرنے والی چیزوں میں دلچسپی لیتے ہیں''

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیر بحث آیت میں گانے بجانے کی بات کی گئی ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ علامہ طارق کہتے ہیں کہ "لہوالحدیث" سے گانا یا موسیقی مراد لینا صریح تحریف یا قرآن میں ایسی چیز کا اضافہ کرنا ہے جسے قرآن ہضم ہی نہیں کرسکتا۔ قرآن نہ تو انسان کی حسی رغبات کو کچلتا ہے اور نہ کھلی چھٹی دیتا ہے۔ وہ خرابی کو خرابی کی حیثیت سے دور کرتا ہے مگر غیر فطری ہتھکنڈوں سے ختم نہیں کرتا۔ فنون لطیفہ، مصوری، موسیقی اور طربیہ رقص انسان کی حسی رغبات سے مربوط ہیں۔ پابندی کے قواعد و ضوابط صاف اور صریح ہونے چاہئیں۔ استدلالات کی کج بحثی کسی کیلئے شریعت نہیں بن سکتی۔

لہٰذا علامہ کے نزدیک "لہوالحدیث" کا تعلق نہ تو گانے بجانے سے ہے اور نہ ہی طربیہ رقص اور موسیقی وغیرہ کی ممانعت سے، اس سلسلے میں علامہ طارق تفصیلی مقالے "ابن حزم کا موسیقی نامہ"، "تصویر اور اسلام" اور "طربیہ رقص" دیکھے جاسکتے ہیں۔ (۶۴)

(۱۸) عورتیں شوہروں کی نسبت استعمال نہ کریں

ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ. (۶۵)

"ان لے پالکوں کو اپنے اصلی آباء کی نسبت سے یاد کرو"

یہ آیت اپنے وسیع تر مفہوم میں عورتوں کو اپنے شوہروں کی طرف سے نسبت دینے سے مانع ہے لیکن آج مسلم معاشرے میں نسبت کے اس اصول کو خاطر میں نہیں لایا جاتا اور عورتیں بے تحاشا اپنے تعارف میں مسز فلاں کہہ کر مطمئن ہو جاتی ہیں۔

علامہ طارق فرماتے ہیں:

"کہ یہاں عربی گرامر کا ایک قاعدہ بھی عورت و مرد کی اضافت میں مانع ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب دو اسم ایک دوسرے کی طرف مضاف ہوں اور کسی طرح کی لفظی وضاحت بھی نہ ہو تو وہاں پہلا اسم بیٹے یا بیٹی کے معنی میں اور دوسرا باپ کیلئے استعمال ہوگا مثلاً (عبداللہ احمد یا عطاء الرحمن عارف یا ذوہیب حنیف) یہاں دو اسم ہیں جو عربی گرامر کی رو سے بیٹے اور باپ کی نسبت کو واضح کرتے ہیں اسی طرح عائشہ صدیق کے معنی ہیں عائشہ بنت صدیق، فاطمہ محمد کہنے سے فاطمہ بنت محمد سمجھا جائے گا"

انگریزی تہذیب و ثقافت کے تسلط کے بعد ہند میں نسبت کا قرآنی یا اسلامی معیار ملحوظ نہیں رکھا گیا اور خواتین میں مردوں کی نسبت فیشن بن گئی اور خواتین بے سوچے اپنے کو مسز فلاح کہنے لگیں یعنی اپنی شخصیت کو شوہر کی شخصیت میں ضم کرنے میں قباحت محسوس نہ کرنے لگیں۔ حالانکہ اسلام نے عورت کی شخصیت کو مستقل خود مختار بنایا ہے، وہ اپنی ذات میں کسی کا جز نہیں بن سکتی، اپنی کمائی کی خود مالک، گھر میں پورے اختیارات استعمال کرنے کی مجاز ہے، وہ نہ ذیلی مخلوق ہے اور نہ کسی غیر کا ضمیمہ، اسی خوبی اور خرابی کے تناظر میں اسلام نے اپنی پالیسی عطا کی کہ خواہ عورت ہو یا مرد نسبت کو صرف اپنے والد سے خاص کرے کہ اس طرح انسان کے نسب و نسل کے تحفظ کے ساتھ اس کی شخصیت بھی ابہام و اشتباہ سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ (۶۶)

(۱۹) مار کر پھر زندہ کرنے کا عمل خداوندی

فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ (۶۷)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

''اللہ نے ان سے کہا ''مرجاؤ'' پھر انہیں زندہ کر دیا''

کہا جاتا ہے کہ یہاں موت اور زندگی کو جمع کر دیا گیا ہے جو بظاہر ناممکن ہے۔ علامہ طارق لکھتے ہیں:

''یہاں موت ذلت اور رسوائی سے استعارہ ہے جیسے ہم کہتے ہیں ''ڈوب مرو'' تو اس طرح کہنے سے صرف پھٹکار اور تذلیل کی طرف اشارہ ہوگا، حقیقت میں کسی کی موت کی بات نہیں ہوگی۔ اسی طرح زندگی استعارہ ہے حالت سنورنے کے بعد ذلت کی کیفیت کے زائل ہونے سے جیسے ہم کہتے ہیں اسے نئی زندگی ملی ہے۔ اس مفہوم کو سورہ دخان کی آیت نمبر ۵۶ کے تناظر میں سمجھا جا سکتا ہے: ''لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَىٰ'' جس کی بابت خود مفسرین کو بھی اعتراف ہے کہ یہاں پہلے ''الموت'' سے ایسی ذلت اور تباہی کی موت مراد ہے جس سے انسان میں روح ہو اور رسوائی کی موت بھی اور دوسرے ''الموتۃ'' سے حقیقی موت مراد ہے جس میں تکرار اور اعادہ نہیں۔ (۶۸)

(۴۰) ذبح عظیم سے کیا مراد ہے؟

فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ (۶۹)

''بتاؤ اب تمہاری رائے کیا ہے''

اعتراض: حضرت ابراہیم نے جب کہا ''اِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ'' میں نے تمہیں ذبح کرنے کا خواب دیکھا ہے اب بتلاؤ کیا کریں؟ اس پر حضرت ذبیح نے کہا ''یا ابت افعل ما تؤمر'' ابا حضور جو فیصلہ کیا ہے کر گذرو۔

علامہ کہتے ہیں یہاں سوال و جواب اور نتیجہ سب ہی خواب کی باتیں ہیں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے آپ نے ذبیح کے ''ذہنی عمق'' کا جائزہ لینے کیلئے خواب ہی میں دریافت کیا؟ اور پھر اندر کے ابراہیم نے زبان ذبیح بن کر خواب ہی میں جواب دیا، ''افعل'' جو فیصلہ کیا ہے کر گزرئیے، کس نے فیصلہ کیا تھا؟ اس کی وضاحت نہیں ہے، تاہم چونکہ اللہ کے حوالے سے بات نہیں ہوئی لہذا یہاں ابراہیم کو اندر کے ابراہیم نے خود ہی ''افعل'' بھی کہا اور خود ہی ''تؤمر'' بھی اور پھر اندر کے ابراہیم ہی نے خواب کی تصدیق بھی کروائی۔ (قد صدقت الرؤیا)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تصدیق تو اس بات کی ہوتی ہے جس کا وجود ہو یہاں ذبح کا وجود ہی ندارد ہے لہذا تصدیق کیسی؟ جی نہیں واقعہ چونکہ خواب کا تھا لہذا سوال و جواب بھی اسی نہج کے ہوں گے اسے خارجی مثال میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ (۷۰)

ذبح عظیم

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (۷۱)

''بلاشبہ خواب کا واقعہ بھیانک تھا اور ہم نے اسے قربانی کا صلہ دے دیا''

اعتراض: اللہ سبحانہ وتعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے ابراہیم کو ذبح عظیم کا بدلہ دے دیا سوال یہ ہے کہ وہ بدلہ کیا تھا؟ ذبح تو ذبح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں ہوئے بدلہ کس چیز کا تھا؟ علامہ کہتے ہیں کہ:

''سیدنا ابراہیم کالیڈیا کے رہائشی اور بڑے پیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے مگر جب توحید خدائے لایزال کی تبلیغ شروع کی تو کالیڈیا کی شاہی فیملی نمرود سے مڈبھیڑ ہو گئی، آخر الامر نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ کو شام و فلسطین کی جانب ہجرت کرنے کا حکم ملا اور یہ علاقہ سرسبز و شاداب اور حسین و جمیل قدرت کے مناظر سے مالا مال تھا، لوگ بڑے خوشحال تھے اللہ تعالیٰ کی برکتیں یہاں سمٹ آئی تھیں، آرام و سکون سے زندگی بسر ہو رہی تھی کہ آپ کو حجاز کی بے آب و گیاہ وادی کی طرف ہجرت کا نیا حکم ملا۔ (''انی ذاھب الی ربی''، صافات ۹۹) اور بلاشبہ ابراہیم سے یہ ایک بڑی قربانی کا مطالبہ تھا یعنی اپنے آرام و آسائش کو تیاگ دے کر کے سرزمین حجاز کی طرف چلے جانا ہی اصل میں ''نفس کشی'' اور آرزوؤں کو ذبح کرنے کا استعارہ ہے۔ یہاں مکہ میں نہ پانی تھا نہ خوردنی پیداوار کا ذریعہ، دکھ ہی دکھ تھا لیکن قربانی تھی جو آپ نے دے ڈالی، اللہ تعالیٰ نے اس کے صلے میں مکہ کی بے آب و گیاہ وادی کو مرکزی حیثیت دے کر ابراہیم و آل ابراہیم کو ابد الآباد تک کیلئے یہاں بسایا اور سامان زیست کی اس طرح فراہمی ہوئی کہ دنیا بھر کی اشیاء فراہم ہونے لگیں۔ اس طرح جو سلسلہ خواب سے شروع ہو کر خواب پر ختم ہوا تھا حقیقت بن کر نمودار ہوا، یہاں نہ ذبح تھا نہ اسے حضرت اسماعیلؑ کا متبادل ٹھہرا کر ذبح کیا گیا۔ (۷۲)

(۲۱) حضرت ابراہیم گلزار میں پہنچ گئے

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَى إِبْرَاهِيمَ (۷۳)

''ہم نے حکم دیا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کیلئے سلامتی کا باعث بن جا'' اس ضمن میں پیر کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں کہ:

''حضرت ابراہیم کیلئے کئی روز تک ایندھن اکٹھا ہوتا رہا لوگوں نے ایندھن فراہم کرنے میں اپنا مذہبی جوش پورا کیا، وہ نذریں مانتے تھے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اتنے گٹھے لکڑیاں لے کر آؤں گا، آخر آگ جلائی گئی جب اس کے شعلے خوب بھڑک اٹھے اور دہکتے ہوئے انگاروں کی تمازت سے پرندے بھی دور بھاگنے لگے تو اب یہ مشکل پیدا ہوئی کہ ابراہیم کو آگ میں کس طرح پھینکا جائے۔ چنانچہ منجنیق بنائی گئی اور حضرت ابراہیم کو قید خانے سے باہر لایا گیا ان کے دست و بازو باندھے گئے جب انہیں منجنیق میں رکھا جانے لگا اور جب منجنیق کو گھما کر آپ کو اس آتش کدہ میں پھینکا گیا تو عالم بالا میں قیامت برپا ہو گئی، اُدھر دہکتے ہوئے انگاروں اور بھڑکتے ہوئے شعلوں کو حکم ملا خبردار اگر میرے خلیل کا ایک بال بھی بیکا ہوا'' (۷۴) جبکہ علامہ طارق کہتے ہیں کہ:

''یہ درست ہے کہ ابراہیم کو جلانے یا مار ڈالنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ سورہ صافات میں ہے کہ: قَالُوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابْنُوا لَهٗ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ (آیت: ۹۷) ’’اس کیلئے ایک عمارت بناؤ (جس میں آگ روشن ہو) اور اسے شعلے مارتی (اس) آگ میں پھینک ڈالو‘‘

لیکن یہ صرف ’’سازش‘‘ تھی۔ عملی طور پر کچھ بھی نہیں ہو پایا تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَأَرَادُوا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ. (صافات:۹۸)

یہ ان کی سازش تھی لیکن ہم نے انہیں نیچا دکھایا (ناکام بنادیا، سازش بارآور نہ ہو سکی)، بلکہ زیر بحث آیت کے ساتھ فرمایا: ’’وَأَرَادُوا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ (انبیاء: ۷۰)‘‘: ’’انہوں نے اس کے خلاف سازش کی مگر ہم نے ان کے ’’کئے دھرے‘‘ کو ناکام بنادیا‘‘

اس طرح یہ تمام آیات مل کر واضح کرتی ہیں کہ معاملہ صرف سازش تک محدود رہا اور عملی طور پر کچھ ظہور پذیر ہونے سے پہلے ہی اس کی ناکامی کے اسباب کر دیئے گئے، رہا یہ کہ ان کی ناکامی اور ابراہیم کی نجات کس طرح ہوئی؟ تو فرمایا:

وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (انبیاء: ۷۱)

ہم نے ابراہیم اور لوط (علیہما السلام) کو اس سرزمین کی طرف بچا نکالا جسے دنیا والوں کیلئے برکت دے رکھی تھی۔

اس طرح مخالفین کے دل میں غیض و غضب کی جو آگ تھی وہ ٹھنڈی پڑ گئی اور ابراہیم ان کے غیض کی آتش سوزاں سے بچ نکلے یعنی کالیڈیا (عراق) سے فلسطین اور وہاں سے مصر اور مصر سے واپس فلسطین اور فلسطین سے حجاز اور حجاز سے پھر ہمیشہ کیلئے فلسطین کو وطن بنا کر ’’تمر ودیوں‘‘ کی گرفت سے دور رہے۔ علامہ آگ کے ٹھنڈے یا مزاج بدلنے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

’’یہاں حقیقی آگ مراد نہیں تھی، غیض و غضب یا فتنے و فساد کی آگ تھی اور اس طرح آگ محاورات عرب کے عین مطابق تھی۔‘‘ فرمایا:

نَارُ اللّٰهِ الْمُوقَدَةُ ○ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ ○ (همزه: ۶تا۷)

’’اللہ کی بھڑکائی ہوئی وہ آگ جو دلوں پر لپکنے والی ہے‘‘

ظاہر ہے کہ دل نہ ’’انگیٹھی‘‘ ہے نہ اس میں ’’انگارے‘‘ بھرے جا سکتے ہیں لہٰذا یہاں آگ بھڑکانے کے معنی دل جلانے اور دل جلنے کے ہیں۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کے مخالفین غیض و غضب کی جس آگ میں جل بھن رہے تھے اللہ نے حضرت ابراہیم کو چلے جانے کا اشارہ کر کے ان کے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔(۵۷)

حرفِ آخر

قرآن پاک رہتی دنیا تک کیلئے کتاب ہدایت اور دستور العمل ہے۔ یہ حقائق و معارف، معانی و مطالب اور علوم کا ایسا لا متناہی سمندر ہے کہ جس کے نہ معانی و مطالب کی کوئی حد ہے اور نہ اسکے حقائق و معارف کی کوئی انتہا، اسلئے ہر نئے آنے والی صورت حال میں قرآن مجید کے احکامات کو اس پر منطبق کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ اس میں ہر دور کے انسانوں کیلئے رہنمائی کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سامان موجود ہے اور ہر دور کے اہل علم کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے دور کے انسانوں کے ہر نئے سوال و چیلنج کا جواب دینے کیلئے اس کتاب کی تعبیر و تفسیر کے فرائض انجام دیں۔

قرآن پاک پر غور و فکر ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ آنے والے وقتوں میں رحمت اللہ طارق جیسی مزید شخصیات سامنے آئیں گی جو قرآنی فکر کو لوگوں میں اجاگر کریں گے کیونکہ اس کتاب کی حکمتیں تا ابد جاری و ساری ہیں بقول علامہ اقبال۔۔۔

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم

حوالہ جات

۱۔ البقرۃ ۲:۲۲۱

۲۔ پیر کرم شاہ الازہری، ضیاء القرآن، جلد اول، ص ۱۰۲، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، رمضان ۱۳۹۹ھ

۳۔ طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص ۶۲، ۶۳، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۴۔ طارق، رحمت اللہ، برہان القرآن، ص ۵۳، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۵۔ طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص ۶۴، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۶۔ نحل: ۱۸

۷۔ سعیدی، غلام رسول، تبیان القرآن، جلد ۸، ص ۳۷، فرید بک سٹال اردو بازار لاہور

۸۔ میزان القرآن، ایضاً، ص ۲۱۲

۹۔ میزان القرآن، ایضاً، ص ۲۱۳

۱۰۔ آل عمران: ۱۳۹

۱۱۔ صلاح الدین، تفسیر احسن البیان، ص ۱۹۲، دارالسلام پبلی کیشنز لاہور، جولائی ۱۹۹۴

۱۲۔ البقرۃ ۲:۱۵۲

۱۳۔ صلاح الدین یوسف، تفسیر احسن البیان، ص ۴۶، دارالسلام پبلی کیشنز لاہور، جولائی ۱۹۹۴

۱۴۔ طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص ۱۰۹، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۱۵۔ صلاح الدین یوسف، تفسیر احسن البیان، ص ۲۰۳، دارالسلام پبلی کیشنز، جولائی ۱۹۹۴

۱۶۔ طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص ۴۲۰، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۲۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۲۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۰۲

۲۰۔ نحل: ۲۰

۲۱۔ طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص ۲۹۲، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۲۲۔ ایضاً، ص ۴۲۰

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲۳_ایضاً،ص۴۲۰

۲۴_نحل:۸۸

۲۵_انبیاء:۳۳

۲۶_طارق،رحمت اللہ،میزان القرآن،ص۴۴۳،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،لاہور،سن ندارد

۲۷_طارق،رحمت اللہ،قرآن کا معاشی نظریہ،ص۱۱۰،۱۱۱،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،لاہور،سن ندارد

۲۸_طارق،رحمت اللہ،قربانی کی شرعی حیثیت،ص۱۲،امر سید میموریل لائبریری،لاہور،طبع سوم جنوری ۲۰۰۲

۲۹_ایضاً،ص۴۸

۳۰_ایضاً،ص۱۶

۳۱_ایضاً،ص۴۸،۴۹

۳۲_صلاح الدین یوسف،احسن البیان،ص۳۶۸،دارالسلام پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۳

۳۳_طارق،رحمت اللہ،میزان القرآن،ص۱۶۸،۱۶۹،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،لاہور،سن ندارد

۳۴_طارق،رحمت اللہ،عورت کی امارت کا مسئلہ،ص۴۱،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،طبع سوم،جولائی ۱۹۸۶

۳۵_ایضاً،ص۶۸

۳۶_صلاح الدین یوسف،احسن البیان،ص۶۹۱،دارالسلام پبلی کیشنز،لاہور،جولائی ۱۹۹۳

۳۷_ایضاً،ص۸۴۱

۳۸_طارق،رحمت اللہ،میزان القرآن،ص۳۱۴،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،لاہور،سن ندارد

۳۹_ایضاً

۴۰_الازہری،پیر کرم شاہ،ضیاء القرآن،جلد سوم،ص۷۷،۷۸،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،لاہور،سن ندارد

۴۱_ایضاً،ص۷۸

۴۲_طارق،رحمت اللہ،میزان القرآن،ص۴۱۰،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،لاہور،سن ندارد

۴۳_العنکبوت:۱۳

۴۴_صلاح الدین یوسف،احسن البیان،ص۵۴۰

۴۵_ایضاً،ص۸۱۴

۴۶_ابراہیم:۴

۴۷_طارق،رحمت اللہ،برہان القرآن،ص۶۵۵،۶۵۶،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،لاہور،سن ندارد

۴۸_سبا:۱۳

۴۹_صلاح الدین یوسف،احسن البیان،ص۵۴۲

۵۰_طارق،رحمت اللہ،برہان القرآن،ص۲۶۴،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،لاہور،سن ندارد

۵۱_ایضاً

۵۲_عمران:۴۷

۵۳_طارق،رحمت اللہ،برہان القرآن،ص۴۵۵،ادارہ ادبیات اسلامیہ،ملتان،لاہور،سن ندارد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۴_ایضاً

۵۵_طارق، رحمت اللہ، برہان القرآن، ص۵۴،۵۵، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۵۶_طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص۹۹، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۵۷_ایضاً، ص۸۹

۵۸_طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص۱۶۰، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۵۹_سبا:۹

۶۰_صلاح الدین یوسف، احسن البیان، ص۵۶۷

۶۱_طارق، رحمت اللہ، برہان القرآن، ص۹۶۸، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۶۲_ایضاً، ص۶۹۰

۶۳_لقمان:۲

۶۴_طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص۶۵۸، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۶۵_الاحزاب:۵

۶۶_طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص۶۹۲،۶۹۳، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۶۷_بقرۃ:۴۳

۶۸_طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص۷۴۳، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۶۹_صافات:۱۰۲

۷۰_طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص۷۴۷، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۷۱_صافات:۱۰۷

۷۲_طارق، رحمت اللہ، میزان القرآن، ص۷۴۷، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

۷۳_ابراہیم:۳۹

۷۴_الازہری، پیر کرم شاہ، ضیاء القرآن، جلد سوم، ص۵۰۶،۵۰۷، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، رمضان ۱۳۹۹ھ

۷۵_طارق، رحمت اللہ، برہان القرآن، ص۶۰۲، ادارہ ادبیات اسلامیہ، ملتان لاہور، سن ندارد

© rasailojaraid.com